© rasailojaraid.com

ایک دوست کی موت پر!

رؤف کلاسرا

ذوالکفل بخاری کو مکہ میں ایک ایکسیڈنٹ کے بعد وہیں پر دفن ہوئے آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں اِس دوران کتنی صدیاں بیت گئیں یا وقت رک گیا تھا، مجھے پتہ نہیں۔ سوچا تھا کہ کسی دوست کی موت کی خبر اتنی جلدی سننے کو ملے گی اور مجھ سے یہ بوجھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اپنے بوڑھے ہونے کا احساس بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی صحرا میں تھکے ہارے مسافر کی جھکی کمر پر کسی نے منوں بوجھ ڈال دیا ہو جو اِس مسافر نے ساری عمر اُٹھائے پھرنا ہے۔ دوستوں کی فون کالز کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مختار پارس سے لے کر جمشید رضوانی، شکیل انجم، جاوید الرحمٰن، خالد سنجرانی،، خالد مسعود۔ مجھے پتہ ہے وہ مجھے کیا خبر دینا چاہتے ہیں۔ اور میں اِن سے بالکل بات نہیں کرنا چاہتا۔

یادوں کا ایک ریلہ ہے اور ان میں میں بھٹکتا اسلام آباد کی سرد اداس شاموں میں تنہا۔ ۱۹۹۳ء کے بعد کا وقت میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ میں زکریا یونیورسٹی ملتان سے فارغ ہوا تھا۔ مختار پارس کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کا اب عادی ہو چکا تھا۔ پارس ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتا کہ بے روزگاری سے زیادہ مجھے اپنے معاشقوں کی فکر تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا کیا بنے گا۔ اُسے اپنے سے زیادہ میرے اور شعیب کے مستقبل کا غم کھائے رکھتا۔ ایک شام پارس نے مجھے بڑی اچھی طرح بریف کیا کہ وہ مجھے مجلسِ احرار کے بانی عطاء اللہ شاہ بخاری کے گھر اُس کے نواسے سے ملانے جا رہا تھا۔ اُس نے مجھے بڑی سختی سے تنبیہہ کی کہ وہاں ہنسی مذاق یا کسی بدتمیزی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں چپ چاپ مداری کے بچے جمورے کی طرح اُس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ایک حویلی میں اتر گیا جہاں ایک ادبی محفل کا انعقاد ہو رہا تھا۔ مجھے ہمیشہ سنجیدہ محفلوں سے ایک عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔ پارس نے میرا تعارف ایک باریش نوجوان سے کرایا۔ پارس نے اپنے بدنامِ زمانہ مخصوص اسٹائل میں ہم دونوں کا ایک دوسرے کو اپنی اوقات سے زیادہ بڑھ چڑھ کر تعارف کروایا۔ میں اور ذوالکفل ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ میرے منہ سے صرف اِتنا نکلا کہ اِن موصوف کی ڈاڑھی پر نہ جائیں۔ یہ جو اوپر سے نظر آ رہے ہیں وہ اندر سے ہرگز ایسے نہیں ہیں۔ مختار پارس نے مجھے گھوری ڈالی جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے تمھیں بدتمیزی سے منع بھی کیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ پارس کچھ مزید لعن طعن کرتا اُس شرارتی آنکھوں والے نوجوان نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور بولا میری زندگی میں یہ پہلا شخص ہے جس نے مجھے صحیح پہچانا ہے۔ یہ میرا ذوالکفل سے پہلا تعارف تھا۔ اور پھر چل سو چل۔ اس کے بعد پتہ نہیں کتنی دوپہریں، شامیں اور راتیں ہم نے اکٹھے گزاریں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہتا کہ کھانا تو آپ نے کھانا ہی ہوگا، اِس کے علاوہ کچھ اور لوازمات بھی بتا دیں۔ میں نے اپنی زندگی کی اچھی چائے ذوالکفل کے گھر بیٹھ کر پی ہوئی ہے۔ میں کبھی حیران ہوتا کہ کیا اِسے کبھی غصہ بھی آتا ہوگا۔ کئی دفعہ ایسے ہوا کہ رات گئے وہ اپنا فون اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ اُسے علم تھا کہ میں نے کچھ عشق کے تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔ کتنی دفعہ اُس نے چپکے سے میری جیب میں پیسے ڈال دیے کیونکہ اُسے علم تھا کہ میری جیب خالی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب ۱۹۹۸ء میں ملتان چھوڑ کر اسلام آباد آنے لگا تو میرے راستے کی سب سے بڑی دیوار جمشید رضوانی، مختار پارس، شکیل انجم اور ذوالکفل جیسے دوست تھے۔ وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ اسلام آباد میں اُس کا پڑاؤ میرے گھر ہوتا۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے کہا کہ مجھے ڈیپوٹیشن پر اسلام آباد لے آؤ۔ میں اُسے ایک افسر دوست کے پاس لے گیا۔ رات کو وہ میرے کمرے میں میرے بستر پر ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اچانک نیند سے بیدار ہو کر مجھے کہا کہ یار یہ بات تو ہم تمھارے دوست کو کہنا بھول گئے کہ وہ نوکری کوئی ایسی ڈھونڈے جہاں کام نہ کرنا پڑے۔ مجھے ہنسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ میں کتنے عرصے تک مختار پارس اور خالد مسعود کے ساتھ مل کر اُس کا مذاق اُڑاتا کہ مولوی اگر تم جوانی میں بھی کام نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں جا کر کرو گے۔ کئی دفعہ میں نے اُسے دھمکی دی کہ میں تمھاری اس بات پر کالم لکھوں گا۔ اور وہ ہمیشہ منت سماجت پر اُتر آتا۔

وہ ایم اے انگلش سے مطمئن نہ ہوا تو نمل یونیورسٹی میں انگریزی بہتر کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ میں اسے اپنے دو کمروں پر محیط فلیٹ میں لے آیا۔ وہ ایک ماہ میرے بیوی بچوں کے ساتھ گھر میں رہا۔ میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو میرا اور میری بیوی کا جھگڑا چپ چاپ سنتا رہا کہ نام کون رکھے گا۔ میری بیوی اُٹھ کر گئی تو صرف اتنا بولا کہ کیا ایک ماں اپنے بچے کو نو ماہ پیٹ میں رکھ کر بھی اِس قابل نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کا نام رکھ سکے۔ تم ویسے تو عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہو لیکن گھر میں ایک ڈکٹیٹر ہو۔ میں نے مسکرا کر بیوی کو بتایا کہ مولوی صاحب نے فتویٰ تمھارے حق میں دے دیا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ چھ مہینے تک اپنے بیٹے کا نام نہیں رکھ سکی تھی۔

مجھے ہمیشہ سے اُس کا سعودی عرب جانا ہضم نہیں ہوا تھا۔ اُسے کئی دفعہ کہا کہ لوٹ آؤ کہ اُس کے بغیر دوستوں کی محفلیں ویران تھیں۔ اُس کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو میں بڑا خوش ہوا۔ پھر پتہ چلا کہ مکہ کی یونیورسٹی میں پروفیسر لگ گیا تھا۔ میں اُس سے ناراض ہو کر لندن چلا گیا۔ وہ اکثر مجھے فون کرتا اور میرے کالموں پر تبصرے کرتا۔ میں خالد مسعود اور مختار پارس کا خوب گلہ کرتا کیونکہ مجھے علم تھا کہ وہ دوستوں کے درمیان ایک پل تھا۔ میں پتہ نہیں زندگی کے کتنے مرحلوں پر اداس اور مایوس ہوا، اور اِس نوجوان دوست نے مجھے ہمیشہ اپنا وقت اور مسکراہٹیں دیں۔ دو بیٹوں کے بعد اُس کی ایک بیٹی پیدائش کے کچھ دنوں بعد اللہ کو پیاری ہوگئی تو بھی وہ ویسا ہی رہا جیسا پہلے تھا۔ وہ اُن دوستوں میں سے تھا جنھیں ہمیشہ یہ پتہ ہوتا تھا کہ کس دوست کو کب کس چیز کی ضرورت تھی۔

ذوالکفل کی اِس اچانک موت نے ایک عجیب سا دکھ دل میں بھر دیا ہے۔ دوست بھی ایک فیملی ہوتے ہیں۔ دوستوں کی موت بھی بوڑھا کر دیتی ہے۔ لگتا ہے کوئی قیمتی چیز کھو سی گئی ہے۔ شاید اب نئے دوست زندگی میں نہ بنائے جاسکیں کہ دوستوں کی موت پر مزید آنکھیں نم نہیں کی جاسکتیں۔ ایک عجیب سا دھواں ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والا شدید درد ہے جو آنکھوں کے ذریعے نہ بہہ سکتا ہے اور نہ ہی رک سکتا ہے۔ ایک ناقابلِ برداشت سے بے کلی ہے۔ اپنے اندر دور تک کہیں بڑھتی ہوئی اذیت ہے۔ بے چینی ہے۔ تنہائی اور اداسی ہے۔ مجھے پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے!

(روزنامہ جنگ ۲۲/نومبر ۲۰۰۹ء)

© rasailojaraid.com